B. A. HONS. I

Bagh-o-Bahar Ki Adabi Ahmiyat

'باغ و بہار' کی ادبی اہمیت

Scanned with CamScanner

اردو کی لازوال کتابوں کی جب فہرست بنائی جاتی ہے، اس وقت نثر کی پہلی کتاب کے بہ طور 'باغ و بہار' کا بلا استثنا انتخاب ہوگا۔ اس کتاب کے مصنف کی شہرت اور حیثیت اپنے زمانے میں کچھ زیادہ نہیں تھی۔ دہلی، لکھنؤ اور عظیم آباد کے قیام کے بعد ملازمت کی تلاش میں بُڑھاپے کے دَور میں میر امّن جب کلکتہ پہنچ کر بہادر علی حسینی کی وساطت سے فورٹ ولیم کالج کے شعبۂ ہندستانی میں مامور ہوتے ہیں، اُس وقت بھی اُن کی تنخواہ محض چالیس روپے طے ہوتی ہے جب کہ اردو کے دوسرے اہلِ قلم اُن سے پانچ گنی ماہانہ تنخواہ حاصل کرتے ہیں۔ اِسے اتفاق کے علاوہ اور کیا کہا جائے کہ میر امن کو جو پہلی کتاب ترجمہ کے لیے ملی، اس کی زبان منتقلی کا کام انھوں نے اس طرح دل لگا کر کیا جس کے سبب 'باغ و بہار' جیسی بے مثال کتاب سامنے آئی۔ آج باغ و بہار کے فارسی اور اردو ماخذات تاریخ کے نہاں خانے میں گم ہو گئے لیکن دو صدیوں سے زیادہ گزر جانے کے باوجود وقت کی گرد سے باغ و بہار نہ صرف محفوظ رہی بلکہ اس کی مقبولیت میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہا۔

فارسی میں شہرت رکھنے والے قصّے 'چہار درویش' کے اردو ترجمے 'نوطرزِ مرصّع' (از عطا حسین خاں تحسین) کو میر امّن نے جان گل کرسٹ کی ہدایت پر ''ٹھیٹھ ہندستانی گفتگو میں جو اردو کے لوگ، ہندو مسلمان، عورت مرد، لڑکے بالے، خاص و عام آپس میں بولتے چالتے ہیں'' ترجمہ کیا۔ میر امّن نے ایک اور ہدایت کو نشانِ راہ بنایا اور ''اسی

Scanned with CamScanner

محاورے سے لکھنا شروع کیا جیسے کوئی باتیں کرتا ہے۔'' فورٹ ولیم کالج کا قیام انگریز ملازمین کو ہندستانی زبان اور تہذیب وثقافت سے آشنا کرنا تھا۔اسی لیے ابتداءً ایسی ہدایات دی گئیں اور نتیجے کے طور پر شعروادب کے عوامی مزاج واسلوب کی طرف جھکاو کے امکانات بڑھے۔ یہ کم دل چسپ بات نہیں کہ میرامّن نے ترجمے کے لیے فارسی کتاب کے بجاے اردو نسخے کو تختۂ مشق بنایا۔شاید آج بھی ادبِ اطفال کے علاوہ کہیں اس کرتب کی گنجایش نہیں کہ اصل اور ترجمہ دونوں کی زبان ایک ہی ہو۔

لیکن میرامّن نوعمروں کے لیے کوئی کتاب نہیں لکھ رہے تھے۔ یہ ضرور کہ اس کتاب کے اوّل مخاطبین ایسی جماعت پر مشتمل تھے جو اردو کے لسانی اور تہذیبی ماحول سے بہت کم واقفیت رکھتے تھے۔ میرامّن نے اگر Reproduction کا کام کیا ہوتا تو 'نوطرزِ مرصّع' کی اہمیت اور مقبولیت میں اضافہ ہونا چاہیے تھا۔اصل کتاب بہرحال اصل ہوتی ہے اور نقل یا ترجمہ کا ذکر یقینی طور پر بعد میں آئے گا۔آج ہمارے پاس 'نوطرزِ مرصّع' اور 'باغ وبہار' دونوں کتابیں موجود ہیں۔ان کے متون کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرامن نے اپنی کتاب پر 'نوطرزِ مرصع' کی ایک ذرا پرچھائیں بھی نہیں پڑنے دی۔اس طرح 'باغ وبہار' ترجمہ تو ہے لیکن اصل کتاب کے انکار کے ساتھ۔محققین نے فارسی قصے کی تلاش میں کافی مشقّت کی ہے،اس کے باوجود پورے طور پر 'باغ وبہار' سے ملتی جُلتی ایک بھی کتاب نہیں۔قصۂ چہار درویش کے الگ الگ نسخوں سے دو چند واقعات اور عبارتیں موجود ہیں۔اس لیے 'باغ وبہار' کو زبان اور قصّے کی ترتیبِ نو کی وجہ سے میرامن کی طبع زاد کتاب مان لینے کو بے جا عقیدت مندی نہیں کہنا چاہیے۔

فورٹ ولیم کالج کے ہندستانی شعبے میں میرامّن تیسرے درجے (ماتحت منشی) کے ملازم بنائے گئے تھے۔ اس کالج سے پہلے وہ کیا تھے اور ان کی علمی فتوحات کی تفصیل کیا ہے،اس کے بارے میں اردو کی ادبی تاریخ خاموش ہے۔ہم عصر تذکروں میں بھی میرامن کے متعلق اطّلاعات برائے نام ہیں،حالاں کہ وہاں چھوٹے بڑے سیکڑوں اہلِ قلم کا گوشوارہ درج ہے۔فورٹ ولیم کالج سے چند برس کی وابستگی کے بعد جب میرامّن کالج سے الگ ہوئے،اس کے بعد ان کی زندگی کیسے گزری،وہ کہاں گئے اور ان کی کب موت ہوئی،اس کے بارے میں کچھ پتا نہیں۔اسی کالج میں انھوں نے 'گنجِ خوبی' کے نام سے ایک دوسری کتاب کا فارسی سے ترجمہ کیا لیکن اردو کی ادبی تاریخ میں اس کا صرف اس لیے ذکر ملتا ہے کہ وہ مصنفِ 'باغ وبہار' کی ایک دوسری تصنیف ہے۔۱۸۰۱ء میں 'باغ بہار' کی تالیف ایک ایسا ادبی واقعہ ہے جس نے ایک گم نام،بالکل معمولی علمی استعداد کے ہنرور کو آسمان کی بلندی عطا کردی۔۱۸۰۲ء میں کالج کی طرف سے اس کتاب پر پانچ سو روپے کا انعام عطا ہونا یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ اُس زمانے میں اس کتاب کا

Scanned with CamScanner

کیسا اثر ہوگا۔

'باغ و بہار' کی اہمیت اردو کے ادبی اور علمی حلقے میں یوں اچانک کیوں قائم ہوئی، اس کے اسباب کی تلاش میں اردو نثر کی روایت سے واقف ہونا ہوگا۔ بہت تلاش اور تحقیق کے بعد بھی اردو میں 'باغ و بہار' سے پہلے نصف ن سے زیادہ ادبی نثر کی کتابیں حاصل نہیں کی جا سکی ہیں۔ 'سب رس'، 'قصۂ مہر افروز و دلبر'، 'نوطرز مرصع' اور 'عجائب القصص' جیسی داستانوں کے علاوہ اردو نثر کے پاس کوئی ایسی جاگیر نہیں جس کے بَل پر وہ اِترائے۔ اس دور کے مسلّم الثبوت شعرا نثر نویسی کے لیے فارسی کو ہی جاے پناہ تصور کر رہے تھے ورنہ کیا ضرورت تھی کہ میرؔ، میر حسنؔ اور مصحفیؔ کے تذکرے فارسی میں لکھے جائیں اور دردؔ کے مذہبی رسائل کی زبان اردو کے بجاے فارسی ہو۔

میر امنؔ نے تاریخ کے اِسی موڑ پر اردو نثر کو نہ صرف اپنی داستان میں وسیلۂ اظہار بنایا بلکہ اس کے نئے اجزا بھی مقرر کر دیے۔ اب نثر قصۂ طولانی نہیں بلکہ لوگوں کی گفتگو اور رہن سہن کا اشاریہ ہے۔ یعنی نثر نے 'باغ و بہار' میں پہلی بار وہ کام شروع کیا جس کے لیے وہ بنی تھی۔ شاعری کو اشرافیت سے نکال کر ہم عصر زندگی کے مسائل اور لسانی گفتگو میں بدل دینے کا انقلابی کام میرؔ نے ابھی حال ہی میں آزمایا تھا۔ میر امنؔ جب 'باغ و بہار' لکھ رہے ہیں، اس وقت محمد تقی میرؔ شہرِ لکھنؤ میں مصنوعی زبان کے سرخیلوں کے مقابلے عام لوگوں کی ایک فطری زبان کو اعتبار بخشنے کی مہم پر بڑھاپے کے باوجود کاربند تھے۔ فورٹ ولیم کالج نے بھی میرؔ کے دیوان کو شائع کر کے یہ بتا دیا تھا کہ جس نئی نثر کا خاکا یہاں تیار ہو رہا ہے، میرؔ اپنی شاعری میں اُس کا پہلے سے ہی استعمال کر رہے تھے۔ لیکن میرؔ کو ہی جب نثر کی ضرورت درکار ہوتی ہے، اس وقت انھیں ایک اَن گڑھ زبان کے مقابلے فارسی کی آزمائی ہوئی دنیا زیادہ کارآمد معلوم ہوتی ہے اور ہندوی راندۂ درگاہ قرار پاتی ہے۔

یہ سوال اپنے آپ میں بہت اہم ہے کہ کس چیز نے 'باغ و بہار' کو ایک چھلانگ میں وہ مقامِ بلند عطا کیا جس سے اس کی آج تک واپسی نہیں ہوئی۔ بعد کے دَور میں غالبؔ جیسے غیر تقلیدی ذہن کو بھی میر امن کی کتاب میں ہی روشنی اور چمک دکھائی دی اور اسی کتاب کی نثر کو بنیاد بنا کر انھوں نے اردو کی جدید نثر کا اپنے خطوط کے ذریعہ ایک نیا کارخانہ قائم کیا۔ بقیہ انیسویں صدی اور تمام و کمال بیسویں صدی میر امن کے انداز و اسلوب سے بہت کم کسی الگ راستے کی طرف بڑھی۔

میر امن کے پاس کوئی نیا قصہ نہیں تھا۔ اُس دور اور اس کے بعد کی داستانوں کو بھی بہ غور دیکھیے تو سب کے قصّے اور انداز ایک دوسرے سے ملتے جلتے دکھائی دیتے ہیں۔ کلیم الدین احمد نے مختلف داستانوں کے آغاز، انجام اور درمیان کے اہم پڑاؤں سے اقتباسات جمع کر کے تقریباً یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ اکثر و بیش تر یکسانیت قائم رہتی ہے۔ قصہ

Scanned with CamScanner

شروع بھی ویسے ہی ہوگا اور اس کا اختتام بھی مختلف نہیں ہوگا۔ درمیان میں کوئی مسئلہ پیدا ہوا تو اُس کا حل بھی مختلف داستانوں میں ایک ہی طرح سے تجویز کیا جائے گا۔ ایسے میں کسی داستان کی انفرادیت بھلا کیسے طے ہوگی؟

باغ و بہار ہماری زبان میں قصہ گوئی کی روایت کا نقطۂ عروج ہے۔ زبانی قصوں کی روایت شاید انسانی تہذیب وثقافت کے متوازی چلتی رہی ہے۔ میر امّن نے تحریری داستان کی بنیاد ''گفتگو'' پر رکھی۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ سب رس سے لے کر نوطرزِ مرصع تک مختلف داستانوں میں مکالمے تو بہت ہیں لیکن ان کتابوں کی اساس ''گفتگو'' نہیں۔ قصے کو بات چیت میں بدل دینا اور بیانیہ کو تحریری آداب سے دور پہنچا دینا اور اس طرح بے اثر کر دینا کہ اس کی اہمیت ہی باقی نہ رہے، میر امّن کی 'باغ و بہار' کی یہی صنفی حکمتِ عملی ہے۔ اک جھٹکے کے ساتھ میر امّن نے اپنے قصے کو عوامی لاشعور میں موجود زبانی داستانوں کی روایت سے جوڑ کر اپنے مخاطبین کا وسیع دائرہ اپنے حلقے میں سمیٹ لیا۔ زبانی قصوں کی تربیت نسل در نسل ہندستانی سماج میں موجود تھی۔ اس لیے میر امّن کو تحریر میں زبانی قصے کی لذّت عطا کرنے کے لیے چہار طرف سے داد ملی اور پھر اردو نثر ایک نئی اور آزاد فضا میں پہنچ گئی جس کے بعد اُس نے وسعت اور بلندی کے کئی مینار دیکھے۔ میر امّن نے نثر کے جو آداب ایجاد کیے، اُسے ہی ردوبدل کے ساتھ تمام نثری اصناف میں پوری اردو آبادی آج تک کامیابی کے ساتھ آزما رہی ہے۔

ایسا نہیں کہ باغ بہار میں گفتگو اور مکالمہ سازی کا کوئی ایک مخصوص پیمانہ بنالیا گیا ہے اور اسی پر تحریر کا مکمل ڈھانچہ قائم کر لیا گیا ہے۔ میر امّن نے گفتگو کی جتنی جہتیں ہو سکتی تھیں، اُن کے اسالیب یہاں دریافت کر لیے ہیں۔ پہلی بات تو یہی کہ انھیں مختلف طبقات کی زبان آتی ہے۔ بادشاہ، امرا، رئیس زادے کے ساتھ ساتھ اندھے، بھیک مانگنے والے اور معصیبت زدہ افراد 'باغ و بہار' میں زبان و بیان اور گفتگو کے ڈھب میں الگ الگ دکھائی دیتے ہیں۔ میر امّن عورتوں کی گفتگو اور اُن کے درجات کو بھی اسی مہارت کے ساتھ انفرادی رنگ میں پیش کر سکتے ہیں۔ کیسی کیسی راز و نیاز کی باتیں، ایسے جذبے جن پر حکومت کے ایوان ڈگمگانے لگیں، انھیں بھی سادگی اور وضاحت سے میر امّن نے گھر آنگن میں اس طرح آراستہ کیا ہے جیسے اس کی انھیں طویل مشق ہے۔ کٹنیوں کی گفتگو بھی نہ صرف اپنے فطری میں ہے بلکہ 'باغ و بہار' میں زندگی کی ایک سحر طراز کیفیت اس سے بھی پیدا ہوتی ہے۔

قصہ گوئی کے تمام روایتی ہنر چُن چُن کر میر امّن نے باغ و بہار کے صفحات پر آزما لیے ہیں۔ اکثر مافوق فطری عناصر آج کے زمانے میں قصے کو بے مزہ کر دیں گے لیکن میر امّن نے ذیلی قصوں میں ان عناصر کو اس طرح سے تھوڑا تھوڑا کر کے شامل کیا ہے کہ بے یقینی اعتماد کے حصار میں چلی آتی ہے۔ دوسرے درویش کی کہانی میں نوفل اور حاتم کا ذکر کرتے ہوئے بوڑھے اور بُڑھیا کا جو پورا واقعہ ہے، اس کے کچھ کردار سچے ہو سکتے ہیں لیکن وہاں ایسے اشخاص کی

4/8
Scanned with CamScanner

بھی موجودگی ہے جو اپنے غیر معمولی افعال کی وجہ سے مافوق فطری رنگ میں ڈھل جاتے ہیں۔ اس کے باوجود قصہ مکمل مستعدی سے اور فطری انداز میں ہمیں قبضے میں لیے رہتا ہے جس سے ہمارا ذہن حقائق کی تلاش کے لیے آزادانہ طور پر سرگرم نہیں ہو پاتا۔

چوتھے درویش کی کہانی میں جہاں ایک اندھے ہندستانی فقیر کا ذکر آتا ہے، قصہ ایک نازک موڑ پر پہنچ کر غیر فطری رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ ایک ہی قصے کے بعض اجزا فطری اور بعض غیر فطری ہو جائیں تو پڑھنے والے کے لیے مرحلۂ امتحان آ جاتا ہے۔ راجندر سنگھ بیدی نے اپنے مشہور افسانے 'ہاتھ ہمارے قلم ہوئے' میں افسانہ نگاری کو 'جھوٹ سچ' سے تشبیہ دی ہے یعنی جب سچ کا بیان کیجیے تو جھوٹ کا گمان ہو اور جب جھوٹی کہانی کہیے تو لوگ اُسے سچ سمجھنے پر مجبور ہو جائیں۔ مافوق فطری عناصر کے ساتھ 'باغ و بہار' کے مصنف کا یہ ہوش و ہنر کا برتاو اردو کی کسی داستان میں دکھائی نہیں دیتا۔ قصے اور کرداروں پر میر امن کی گرفت اتنی پختہ ہے کہ وہ کسی کو بھی اپنی دسترس سے بہت دوٗر نہیں جانے دیتے۔ چاروں درویش اور خود آزاد بخت سب کی زندگی ایک خاص ناپ تول کے ساتھ ہمارے سامنے آتی ہے۔ سب اپنے اپنے طریقے سے جبرِ مشیّت کی کہانی کہتے نظر آتے ہیں۔ کوئی ایسا نہیں جس کا گذشتہ آسایشوں سے بھرا نہیں تھا لیکن صبر آزما موجود سے سب ہراساں ہیں۔ اسی لیے ہر درویش، یہاں تک کہ بادشاہ آزاد بخت بھی اپنے گذشتہ کا اعادہ کرتا ہے اور ماضی کی سیر کر خوش وقتی حاصل کر لیتا ہے۔

'باغ و بہار' کے قصے ہندستان سے متعلق نہیں ہیں۔ عرب و ایران کی فضاؤں میں اُن کی گہری جڑیں ہیں۔ قصے کا سرا چین سے جا ملتا ہے۔ عرب و ایران کی اسلامی فضا کے ساتھ چین کے قصے میں بھی کردار غیر اسلامی نہیں ہیں۔ کہنا چاہیے کہ باغ و بہار کی دنیا مذہب اسلام سے متعلق ہے لیکن اس قصے کا لکھنے والا ہندستان کا باشندہ ہے۔ حالاں کہ وہ کلکتے کے ایک نئے معاشرے کا حصہ ہے لیکن اس کا ماضی دہلی کی مرکزیت کا پرستار ہے۔ وہ خود کو بھی ''دتّی والا'' موسوم کرتا ہے۔ دتّی کی تہذیب اور زبان و بیان کی مہارت کا تذکرہ وہ اس طرح کرتا ہے : ''جو شخص سب آفتیں سہہ کر دتّی کا روڑا ہو کر رہا اور دس پانچ پشتیں اسی شہر میں گزریں اور اُس نے دربار امراؤں کے اور میلے ٹھیلے، عرس، چھڑیاں، سیر تماشا اور کوچہ گردی اس شہر کی مدّت تلک کی ہوگی اور وہاں سے نکلنے کے بعد اپنی زبان کو لحاظ میں رکھتا ہوگا، اس کا بولنا البتہ ٹھیک ہے۔''

میر امّن زبان اور تہذیب و ثقافت کو الگ الگ نہیں مانتے۔ اسی لیے کلکتے میں بیٹھ کر انگریزوں کی ہدایت اور مشورے سے بھی جب وہ قصہ گوئی کرتے ہیں، اس وقت وہ دتّی کی زبان اور تہذیب کی ہی عکاسی کرتے نظر آتے ہیں۔ آج کے زمانے میں ناول نگاری کے پیچھے ایک ڈیٹا بیس (Data-base) یا تحقیقی اور تاریخی شعور کی موجودگی

SAFDAR IMAM QUADRI

Scanned with CamScanner

ضروری بات مان لی گئی ہے۔قرۃ العین حیدر یا وکرم سیٹھ اپنے نئے ناول کے مواد کے لیے مختلف شہروں اور ممالک کی لائبریریوں میں کئی کئی برس وقت صَرف کرتے ہیں؛ اس اطلاع پر حیرت اس وجہ سے نہیں ہوتی کہ فکشن نے علم وفن کے مختلف غیر روایتی اسالیب بھی اپنے تن بدن میں سمیٹ لیے ہیں۔میرامن کے زمانے میں داستان نویسی کے شعبے میں تحقیق کی ایسی کسی روایت کا پتا نہیں چلتا۔علم کا پھیلاو بھی محدود تھا۔میرامن کی عام معلومات کا یہ حال ہے کہ وہ فارس اور ایران کو دو مُلک سمجھتے ہیں۔اب اس آدمی سے کون امید کرے گا کہ بصرہ، آذربائجان، قسطنطنیہ، یمن اور چین جیسے دوٗر کے مقامات کے افراد اور اُن کی معاشرت کے بارے میں وہ ٹھوس اطّلاعات دے سکتے ہیں۔

ایسے موڑ پر میرامن نے قصّہ گوئی کا ایک نیا راستہ ڈھونڈ لیا۔میرامن دلّی والے تھے اور یہاں دس پانچ پشتوں سے رہنے کا فخر بھی اُن میں تھا۔اس لیے قصّہ وہ جہاں اور جس مقام کا لکھ رہے ہوں، اُس کے متن میں ہندستانی امور اپنے آپ داخل کرتے چلتے ہیں۔اسی وجہ سے 'باغ و بہار' ہند اسلامی معاشرت کی بہترین ترجمان بن کر ہمارے سامنے آتی ہے۔قصّے میں روم کا ذکر ہو رہا ہے، کئی کئی صفحات کے بعد دوسرے ممالک کے الفاظ بھی داخل کیے جا رہے ہیں لیکن پڑھنے والا اُسے قلعۂ معلّٰی سے وابستہ کر کے بہ آسانی آگے بڑھ سکتا ہے۔ڈاکٹر سلیم اختر نے آزاد بخت کو تو مکمّل ایک مغل بادشاہ کی طرح دیکھنے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔'باغ و بہار' کی شہزادیاں بھی مغلوں جیسی دکھائی دیتی ہیں۔تعویذ اور گنڈا بنوانا، شبھ لگن کا خیال رکھنا، جنم کنڈلی بنوانا اکبر کے دَور سے ہی محل سَرا میں یہ باتیں موجود ہیں۔میرامن 'باغ و بہار' میں قصّے کے بیچ بیچ میں ان امور کو بکھیر دیتے ہیں۔

محل اور کھنڈروں کی تفصیل، پرانی شاندار عمارتوں کا بیان اور سخاوت و شجاعت کے ساتھ مہمان نوازی کے اعمال کی تان ایسے ٹوٹتی ہے جیسے محسوس ہو کہ مغلوں کا دورِ عروج ابھی ابھی ختم ہوا ہے۔اٹھارویں اور انیسویں صدی کا شاید ہی کوئی اردو ادیب ہو جس کے لاشعور میں مغلوں کے زوال کا کرب موجود نہ ہو۔میر سے لے کر ، تک اس کا ایک سلسلہ دکھائی دیتا ہے۔میرامن ان دونوں کے درمیان میں آتے ہیں لیکن وقت کے عتاب ، ان دونوں سے شاید زیادہ ہی جھیلتے رہے۔دربدری کا عذاب میر صاحب سے کم میرامن کے حصّے میں نہیں آیا۔ اس لیے میرامن کی یادوں میں بھی مغلوں کی تاراجی اور شکست و ریخت ایک ایسا زخم ہے جسے ایّام گذشتہ کے پھول اور خوشبو ہی مرہم لگا سکتے ہیں۔باغ و بہار کے قصّے کا مواد اصل میں میرامن کے ذاتی زخم کا مداوا بھی ہے۔اسی لیے شہزادوں کے نام اور مقامات کے علاوہ اس قصّے کی پوری دنیا ہندستانی ہے۔ہند اسلامی فضا اور مشترکہ کلچر پر ایسا یقین اور طمانیتِ قلبی اس سے پہلے اردو کی کسی تحریر میں موجود نہیں۔

6/8

6

ناقدین نے باغ و بہار کو 'زندہ نثر' کی کتاب کہا ہے۔گذشتہ دو سو برسوں میں باغ و بہار کے تعلق سے جس

Scanned with CamScanner

قدر بھی لکھا گیا ہے، اس کا نقطۂ عروج باغ و بہار کی زبان اور اسلوب کی تعریف ہے۔ اس موضوع پر کوئی تنازعہ نہیں کہ پڑھنے والے کو یہاں ایک نئی زبان میسّر آتی ہے۔ بیان کا یہ نیا لہجہ نہ صرف ہمیں چونکاتا ہے بلکہ اس بات کے لیے بھی داد طلب ہوتا ہے کہ ایسی نثر نہ کسی پُرانی کتاب میں ہے اور نہ آج تک دو صدیوں کے بعد کسی کو ایسی قدرتِ کلام حاصل ہوئی۔ صنف کی حیثیت سے داستان تاریخ کے دفینے میں سمٹ گئی۔ 'باغ و بہار' کا قصّہ اب نہ ہمیں چونکاتا ہے اور نہ اس کے سچ ہونے کا التباس پیدا ہوسکتا ہے۔ یہ کتاب جس ادارے کے لیے لکھی گئی، اس ادارے کا بھی سیکڑوں سال پہلے زوال ہو چکا۔ جس مقصد کے تحت 'باغ و بہار' کی تالیف ہوئی، اس کی کوئی ضرورت اور افادیت اب باقی نہیں۔ اس کے باوجود، اردو نثر کی ایک بھی کتاب شاید ہی باغ و بہار جیسی مقبولیت حاصل کر سکی ہو۔ ہر دور میں 'باغ و بہار' کے دائرۂ اثر میں روز بہ روز اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔

'باغ و بہار' میں عام لوگوں کی بول چال کو اہمیت دی گئی ہے۔ میرامّن کا یہ پہلا اصولی اجتہاد ہے۔ پیش لفظ میں ہی وہ وضاحت کر دیتے ہیں کہ اس کتاب کا ترجمہ وہ اُس زبان میں کر رہے ہیں جس میں تمام قومیت اور جمعیت محوِ گفتگو ہوتی ہے۔ اس وجہ سے میرامن نے فارسی اور عربی روایات سے گریز اور ہندوی لہجے کی طرف کشش کی حکمتِ عملی اپنائی۔ میرامن نے اس تجربے کو اُس آدھے ادھورے طریقے سے استعمال نہیں کیا جس طرح اُس زمانے کے بعض بڑے شعرا کر رہے تھے۔ اس کے برعکس میرامّن کے یہاں ایک منضبط طریقۂ کار دکھائی دیتا ہے۔ اس لیے اُن کا پہلا ٹکراؤ قواعد نویسوں سے ہوا۔ میرامن کی تحریر میں بعض ناقدین نے قواعد اور صرف و نحو کے تسامحات پہلی نظر میں تلاش کر لیے۔ کیا اس سے یہ سمجھ لیا جائے کہ میرامن قواعد و انشا کے معمولی ضابطے بھی نہیں جانتے تھے؟ ایسا نہیں ہے۔ میرامّن چاہتے تو انھیں درست کر کے رواجِ عام کے مطابق کر لیتے اور اپنے معاصرین سے داد وصول کر لیتے لیکن میرامن اپنی کتاب کے آغاز میں بتا چکے ہیں کہ وہ ''گفتگو کی زبان'' لکھ رہے ہیں۔ بات چیت اور تحریر کے آداب میں فرق ہوتا ہے۔ صرف بعد کے دنوں میں غالب کو یہ ہنر آیا کہ دونوں اسالیب باہم ہو جائیں۔ اس لیے میرامن نے گفتگو کو انشا کے قواعد پر فوقیت دی۔ جملے میں مختلف ٹکڑے الگ الگ ترتیب سے تحریر و تقریر کا حصہ بنتے ہیں۔ میرامن گفتگو کو ''لکھنے'' میں کیسی قدرت رکھتے ہیں، ملاحظہ کیجیے: 'اس وزیر کی ایک بیٹی تھی، برس چودہ پندرہ کی، نہایت خوب صورت اور قابل، نوشت و خواند میں درست۔' (آزاد بخت کا بیان)۔ ملکہ کی تلاش کا ایک منظر اس طرح ہمارے سامنے آتا ہے۔ 'ایک مکان سے آواز میرے کان میں پڑی جیسے کوئی مناجات کر رہا ہے۔ آگے جا کر دیکھوں تو ملکہ ہے کہ عجیب حالت سے روتی ہے'۔ ان جملوں کو دیکھنے سے یہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ گفتگو کے انداز پر تحریر کے قاعدوں کو قربان کر دیا گیا ہے۔

Scanned with CamScanner

رشید حسن خاں نے بڑی تفصیل سے میر امن کے خلافِ قاعدہ استعمالات کی فہرست پیش کر دی ہے۔ واحد کو جمع اور جمع کو واحد، مذکر کو مونث اور مونث کو مذکر، 'نے' اور 'کو' کے استعمال کا مناسب ڈھب انھیں معلوم نہیں، بے وجہ جمع الجمع بنانے اور تکرارِ الفاظ کے کرتب کی عادت، فارسی اور ہندوی کے الفاظ کا بے جوڑ ارتکاز؛ میر امن کی نثر کے یہ سب مخصوصات ہیں۔ آخر اس سے کون سا نتیجہ اخذ کیا جائے؟ ایک نظر میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ میر امن نے غلط عبارت لکھی، قواعد کی انھیں معمولی شدبد نہیں، علم وفن کے وہ کچے بھی ہیں۔ تذکیر وتانیث کی درجنوں غلطیاں بھلا کیوں کر معاف ہوں؟

مسلّمہ روایت سے اس بے پروائی کے باوجود 'باغ و بہار' کی نثر شہرت اور مقبولیت میں آسمان تک کیسے پہنچ گئی؟ آخر وہ کون سا جادو ہے جس نے 'باغ و بہار' کو قواعد وضوابط سے پَرے جا کر عظمت کا تاج عطا کیا۔ یہیں اس سوال کا جواب بھی پوشیدہ ہے کہ 'یہ زندہ نثر کی کتاب' ہے۔ یہ بھی خوب کہ نثر اور شاعری بھی 'زندہ' اور 'مردہ' ہونے لگی۔ لیکن سچائی یہی ہے کہ زندہ کتاب تو 'باغ و بہار' ہی ہے۔ دوسو سال سے زیادہ اُس کی اپنی عمر ہوگئی۔ اس سے الگ، غالب، سرسیّد، محمد حسین آزاد، شبلی اور پریم چند سے لے کر دورِ جدید کے اہلِ قلم تک؛ کون ایسا لکھنے والا ہے جس نے میر امن کی اس کتاب سے زندگی اور روشنی لیے بغیر اپنا سفر شروع نہ کیا ہو۔ اپنی اہمیت کے باوجود 'فسانۂ عجائب' کی نثر کو قابلِ اتّباع تصور نہیں کیا جا سکا جب کہ 'باغ و بہار' کے زیرِ سایہ گذشتہ دوصدیوں کی اردو آبادی اپنی بہترین نسلیں سامنے لا چکی ہے۔ قرائن بتاتے ہیں کہ آگے بھی اسی نثر کا سلسلہ قائم رہنے والا ہے۔

'باغ و بہار' کا طریقۂ استعمال غلط ہو، عبارتیں بے سلیقہ معلوم ہوں، قواعد نویسوں کی جبینیں شکن آلود ہو جائیں بھاری پڑ جائیں لیکن میر امّن نے یہ ادا اپنے وقت کے ''ہندو مسلمان، عورت مرد، لڑکے بالے، خاص وعام'' کے اندازِ گفتگو سے اخذ کی ہے۔ زندہ روایتوں پر انحصار کرنا اور قواعد کی مردہ کتابوں سے بے پروا ہو جانا میر امن کی ادبی اور تاریخی دوراندیشی ہے۔ وقت نے دیکھا کہ میر امن کی اُسی ''غلط'' زبان کو سب نے سراہا، انھی استعمالات کو ادیبوں اور شاعروں نے سکۂ رائج الوقت سمجھا۔ میر امن نے اردو نثر میں جو جادو نگاری کی تھی، اُس کا سحر روز بہ روز بڑھتا گیا اور آج ایک مختصر سی کتاب جس کے قصے، مواد اور صنف کسی کی اہمیت باقی نہیں رہی، اس کے باوجود اردو کی ادبی تاریخ میں واقعتاً باغ و بہار ہے۔

Scanned with CamScanner